



دیوندرستیا رتھی

(1908—2003)

دیوندرستیا رتھی پنجاب کے ضلع سنگرور میں پیدا ہوئے۔ 1925 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ 1927 میں تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جگہ جگہ گھوم کر انھوں نے ہزاروں لوک گیت جمع کیے۔ کچھ عرصے تک دہلی میں انڈین فارمنگ کی ادارت کی۔ 1948 سے 1956 تک آج کل (ہندی) کے مدیر رہے۔ 1976 میں انھیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

دیوندرستیا رتھی کی پہلی اردو کہانی 'اور بانسری بجاتی رہی' لاہور کے مشہور رسالے 'ادب لطیف' میں شائع ہوئی۔ 'نئے دیوتا' اور 'بانسری بجاتی رہی' اور 'چائے کا رنگ' ان کے اردو افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ 'دھرتی گاتی ہے'، 'میں ہوں خانہ بدوش' اور 'گائے جا ہندوستان' لوک گیتوں کے مجموعے ہیں۔ دیوندرستیا رتھی نے اردو کے علاوہ ہندی اور پنجابی میں بھی علمی اور ادبی سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کے افسانوں کی بنیاد دیو مالاؤں اور لوک گیتوں پر ہے۔



5019CH05

اُن دیوتا

”تب اُن دیو، برہما کے پاس رہتا تھا۔ ایک دن برہما نے کہا ”اوبھلے دیوتا! دھرتی پر کیوں نہیں چلا جاتا؟“ ان الفاظ کے ساتھ چنٹو نے اپنی دل پسند کہانی شروع کی۔ گونڈوں کو ایسی میسیوں کہانیاں یاد ہیں۔ وہ جنگل کے آدمی ہیں اور ٹھیک جنگل کے درختوں کی طرح اُن کی جڑیں دھرتی میں گہری چلی گئی ہیں۔ مگر وہ غریب ہیں، بھوک کے پیدائشی عادی۔ چنٹو کو دیکھ کر مجھے یہ گمان ہوا کہ وہ بھی ایک دیوتا ہے جو دھرتی کے باسیوں کو اُن دیو کی کہانی سنانے کے لیے آ نکلا ہے۔ گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں بغل کی پگڈنڈی کسی جوان کی مانگ معلوم ہوتی تھی۔ گھوم پھر کر میری نگاہ چنٹو کے ٹھریوں والے چہرے پر جم جاتی۔

کہانی جاری رہی..... دیوتا دھرتی پر کھڑا تھا، پر وہ بہت اونچا تھا۔ بارہ آدمی ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہوتے، تب جا کر وہ اُس کے سر کو چھو سکتے۔

ایک دن برہما نے سندیس بھیجا۔ یہ تو بہت کٹھن ہے، بھلے دیوتا! تجھے چھوٹا ہونا ہوگا۔ آدمی کا آرام تو دیکھنا ہوگا۔ دیوتا آدھا رہ گیا۔ برہما کی تسلی نہ ہوئی۔ آدمی کی مشکل اب بھی پوری طرح حل نہ ہوئی تھی۔ اُس نے پھر سندیس بھیجا اور دیوتا ایک چوتھائی رہ گیا۔ اب صرف تین آدمی ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہو کر اس کے سر کو چھو سکتے تھے۔

پھر آدمی خود بولا ”تم اب بھی اونچے ہو، میرے دیوتا!“..... ان دیو اور بھی چھوٹا ہو گیا۔ اب وہ آدمی کے سینے تک آنے لگا۔ پھر جب وہ کمزور رہ گیا تو آدمی بہت خوش ہوا۔

اُس کے جسم سے بالیں پھوٹ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سونے کا پیڑ کھڑا ہے۔ آدمی نے اُسے جھنجھوڑا اور بالیں دھرتی پر آگریں۔

میں نے سوچا، اور سب دیوتاؤں کے مندر ہیں۔ مگر اُن دیو، وہ کھیتوں کا قدیمی سرپرست کھلے کھیتوں میں رہتا ہے، جہاں ہر سال دھان اگتا ہے۔ نئے دانوں میں دودھ پیدا ہوتا ہے۔

ہلدی بولی ”اب تو دیوتا دھرتی کے بچوں بچ کہیں پاتال کی طرف چلا گیا ہے۔“

چنٹو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ایسا بھیانک کال اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ دھرتی

بجھر ہو گئی تھی۔

سال کے سال ہلدی اَن دیو کی مَنّت مانتی تھی۔ ایک ہلدی پر ہی بس نہیں، ہر ایک گونڈ عورت یہ مَنّت ماننا ضروری سمجھتی ہے۔ مگر اس سال دیوتا نے ایک نہ سُنی۔ کس بات نے دیوتا کو ناراض کر دیا؟ غصّہ تو اور دیوتاؤں کو بھی آتا ہے مگر اَن دیو کو تو غصّہ نہ کرنا چاہیے۔

ہلدی کی گود میں تین ماہ کا بچہ تھا، میں نے اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ اس کا رنگ اپنے باپ سے کم سناؤں تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے تازہ پہاڑی شہد کا رنگ یاد آ رہا تھا۔

ہلدی بولی ”ہائے اَن دیو نے میری کوکھ ہری کی اور وہ بھی بھوک میں اور لا چاری میں۔“
بچہ مسکراتا تو ہلدی کو یہ خیال آتا کہ دیوتا اُس کی آنکھوں میں اپنی مسکراہٹ ڈال رہا ہے۔ پر اس کا مطلب؟ دیوتا مذاق تو نہیں کرتا؟ پھر اُس کے دل میں غصّہ بھڑک اٹھتا۔ دیوتا آدمی کو بھوکوں بھی مارتا ہے اور مذاق اڑا کر اس کا دل بھی جلاتا ہے۔
چنٹو بولا ”اس کی کہانی جو میں آج کی طرح سو سو بار سنا چکا ہوں، اب مجھے زری گپ معلوم ہوتی ہے۔“
ہلدی یہ نہ جانتی تھی کہ چنٹو کا طنز بہت حد تک سَطحی ہے۔ یہ وہ بھی سمجھنے لگی تھی کہ دیوتا روز روز کے پاپ نائک سے ناراض ہو گیا ہے۔

”اَن دیو کو نہیں مانتے پر بھگوان کو تو مانو گے۔“

”میرا دل تو تیرے بھگوان کو بھی نہ مانے۔ کہاں ہیں اس کے میگھ راج؟ اور کہاں سور ہا ہے وہ خود؟ ایک بُند بھی تو نہیں برستی!“
”دیوتا سے ڈرنا چاہیے اور بھگوان سے بھی۔“

چنٹو نے سنبھل کر جواب دیا ”ضرور ڈرنا چاہیے..... اور اب تک ہم ڈرتے ہی رہے ہیں!“
”اب آئے ناسیدھے رستے پر۔ جب میں چھوٹی تھی ماں نے کہا تھا، دیوتا کے غصّے سے سدا بچو!“
”اری کہا تو میری ماں نے بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پر کب تلک لگا رہے گا یہ ڈر، ہلدی؟“

دیوتا پھر خوش ہوگا اور پھر لہرائے گا وہی پیارا پیارا دھان؟

کال میں پیدا ہوئے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگا ”اتنا بڑا پاپ کیا ہوگا کہ اتنا بڑا دیوتا بھی آدمی کو چھما (معاف) نہیں کر سکتا!“

کال نے ہلدی کی ساری سندرتا چھین لی تھی۔ چنٹو بھی اب اپنی بہار کو بھول رہا تھا..... درخت اب بھی کھڑا تھا مگر ٹھنڈیاں

پرانی ہوگئی تھیں اور نئی کوئلیں نظر نہیں آتی تھیں۔

ہلدی کا بچہ میری گود میں رونے لگا۔ اُسے لیتے ہوئے اُس نے سہمی ہوئی نگاہ سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ بولی ”یہ کال کب جائے گا؟“

”جب ہم مرجائیں گے اور نہ جانے یہ تب بھی نہ جائے۔“

”یہ کنکی اور کودوں دھان کی طرح پانی نہیں مانگتے۔ یہ بھی نہ اُگے ہوتے تو ہم کبھی کے بھوک سے مر گئے ہوتے..... انھوں نے ہماری لاج رکھ لی..... ہماری بھی، ہمارے دیوتا کی بھی۔“

”دیوتا کا بس چلتا تو انھیں بھی اُگنے سے روک دیتا.....“

”ایسا بول نہ بولو۔ پاپ ہوگا۔“

”میں کب کہتا ہوں پاپ نہ ہو۔ ہو، سو بار ہو۔“

”نہ نہ، پاپ سے ڈرو۔ اور دیوتا کے غصہ سے بھی۔“

میں نے بچہ بچاؤ کرتے ہوئے کہا ”دوس تو سب آدمی کا ہے۔ دیوتا تو سدا ز دوس ہوتا ہے۔“
رات غم زدہ عورت کی طرح پڑی تھی۔ دُور سے کسی خونی درندے کی دھاڑ گونجی۔ چنٹو بولا ”ان بھوکے شیروں اور ریچھوں کو اُن دیو مل جائے تو وہ اسے کچا ہی کھا جائیں۔“

بیساکھو کے گھر روپے آئے تو ہلدی اسے بدھائی دینے آئی ”پیتا میں پچیس بھی پانچ سو ہیں، رامو سدا سکھی رہے۔“
”اُن دیو سے تو رامو ہی اچھا نکلا۔“ بیسا کھونے فرمائی قہقہہ لگا کر کہا۔

چنٹو بولا۔ ”ارے یار چھوڑ اس اُن دیو کی بات.....“

ہلدی نے اپنے خاوند کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس طنز سے اُسے چڑھتی۔ ”دیوتا کتنا بھی بُرا کیوں نہ ہو جائے۔ آدمی کو تو اپنا دل ٹھیک رکھنا چاہیے، اپنا بول سنبھالنا چاہیے۔“

غصے میں جلی بھنی ہلدی اپنی جھونپڑی کی طرف چل دی۔ بیسا کھونے پھر قہقہہ لگایا۔ ”واہ بھئی واہ۔ اب بھی اُن دیو کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔“

چنٹو بولا ”جینے دو اُسے اُن دیو کی مالا۔“

رامو بمبئی میں تھا۔ چنٹو سوچنے لگا، کاش اس کا بھی بھائی وہاں ہوتا اور پچیس روپے نہیں تو پانچ ہی بھیج دیتا۔

میساکھونے پوسٹ مین کو ایک دوٹی دے دی تھی۔ مگر اُسے اس بات کا افسوس ہی رہا۔ بار بار وہ اپنی نقدی گنتا اور ہر بار دیکھتا کہ اُس کے پاس چوبیس روپیے چودہ آنے ہیں، پچیس روپیے نہیں۔

جھونپڑی میں واپس آیا تو چنٹو نے ہلدی کو بے ہوش پایا۔ اُس نے اُسے جھنجھوڑا۔ ”رسوئی کی بھی فکر ہے۔ اب سو نہیں، ہلدی۔ دوپہر تو ڈھل گئی.....“

اُس وقت اگر خود اُن دیوبھی اُسے جھنجھوڑتا تو ہوش میں آنے کے لیے اُسے کچھ دیر ضرور لگتی۔

تھوڑی دیر بعد ہلدی نے اپنے سر ہانے بیٹھے خاوند کی طرف گھور کر دیکھا۔ چنٹو بولا ”آگ جلاؤ، ہلدی!.....“ دیکھتی نہیں ہو بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔“

”پکاؤں اپنا سر؟“

چنٹو نے ڈرتے ڈرتے سات آنے ہلدی کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا ”یہ میساکھونے دیے ہیں ہلدی، اور میں سچ کہتا ہوں میں نے اُس سے مانگے نہ تھے۔“

ہلدی شک بھری نگاہوں سے چنٹو کی طرف دیکھنے لگی۔ کیا آدمی غریبی میں اتنا گر جاتا ہے؟ مگر چنٹو کے چہرے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس نے مانگنے کی ذلیل حرکت نہیں کی تھی اور پھر جب ایک ایک کر کے سب کے سب پیسے گنے تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں..... چار روز دال بھات کا خرچ اور چل جائے گا۔

”شکر ہے۔ اُن دیوکا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“

”اُن دیوکا یا میساکھو کا؟“

”اُن دیوکا، جس نے میساکھو بھائی کے دل میں یہ پریم بھاؤ پیدا کیا۔“

چنٹو کا چہرہ دیکھ کر ہلدی کو سوکھے پتے کا دھیان آیا جو ٹہنی سے لگا رہنا چاہتا ہو۔ دور ایک بدلی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ”کاش! بوند باندی ہی ہو جائے۔“ مگر تیز ہوا بدلی کو اڑا لے گئی اور دھرتی بارش کے لیے برابر ترستی رہی۔

کال نے زندگی کا سب لطف برباد کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا دھرتی رو دے گی۔ مگر آنسوؤں سے تو سوکھے دھانوں کو پانی نہیں ملتا۔ اُن دیوکو یہ شرارت کیسے سوجھی؟ مان لیا کہ وہ خود کسی وجہ سے کسانوں پر ناراض ہو گیا ہے مگر بادلوں کا تو کسانوں نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ کیوں نہیں گھر آتے؟ کیوں نہیں برستے؟ کاش وہ دیوتا کی طرف داری کرنے سے انکار کر دیں۔

چار ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

اُس روز یہاں دو تین سو گونڈ جمع ہوئے۔ پھڈ کے صاحب اور منشی جی دھان بانٹ رہے تھے۔ اپنے حصے کا دھان پا کر ہر کوئی دیوتا کی بے مناتا— اُن دیو کی بے ہو۔

چنٹو گاؤں کی پچائیت کا دایاں بازو تھا۔ دھان بانٹنے میں وہ مدد دے رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بھی ایک ضروری آدمی ہے۔ مگر لوگ دیوتا کی بے بے کار کیوں مناتے ہیں؟ کہاں ہے؟..... وہ خود بھی شاید دیوتا ہے..... اور شاید اُن دیو سے کہیں.....“

ہلدی نے سوچا کہ یہ دھان شاید اُن دیو نے بھیجا ہے۔ اُسے دکھیارے گونڈوں کا خیال تو ضرور ہے۔ مگر جب اُس نے پھڈ کے صاحب اور منشی جی کو حلو اڑاتے دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ حلوے کا خیال اب آگے نہ بڑھے۔ پر یہ خیال بادل کی طرح اس کے ذہن پر پھیلتا چلا گیا۔

فقط سبھا سے ملا ہوا دھان کتنے دن چلتا؟

چنٹو کے چہرے پر موت کی دھندلی پرچھائیاں نظر آتی تھیں، مگر وہ دیوتا سے نہ ڈرتا تھا۔ کبھی کبھی گھٹنوں کے بل بیٹھا گھٹنوں غیر شعوری طور پر گالیاں دیا کرتا۔ میں نے سمجھا کہ وہ پاگل ہو چلا ہے۔ دو چار بار میں نے اُسے روکا بھی۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ وہ دیوتا کو اپنے دل سے نکال دینا چاہتا تھا۔ مگر دیوتا کی جڑیں اس کے جذباتوں میں گہری چلی گئی تھیں۔

ایک دن چنٹو بہت سویرے اٹھ بیٹھا اور بولا ”دیوتا اب دھنوں کا ہو گیا ہے..... پاپی دیوتا! اری میں تو نہ مانوں ایسے دیوتا کو۔“

”پر نہیں، میرا دیوتا تو سب کا ہے۔“

”سب کا ہے۔ اری یگی، یہ سب گیان جھوٹا ہے۔“

”پر دیوتا تو جھوٹا نہیں۔“

”تو کیا وہ بہت سچا ہے؟ سچا ہے تو برکھا کیوں نہیں ہوتی؟“

”دیوتا کو برا کہنے سے دوس ہوتا ہے۔“

”ہزار بار ہو..... وہ اب ہمارے کھیتوں میں کیوں آئے گا؟ وہ دھنوں کی ہوری کچوری کھانے لگا ہے۔ نزدھن

گونڈوں کی اب اُسے کیا پروا ہے؟“

چنٹو کی نکتہ چینی ہلدی کے من میں غم گھول رہی تھی۔ اُس نے جھونپڑی کی دیوار سے ٹیک لگالی اور دھیرے دھیرے اچھے

وقتوں کو یاد کرنے لگی، جب بھوک کا بھیانک منہ کبھی اتنا نہ کھلا تھا۔ وہ خوشی پھر لوٹے گی، دیوتا پھر کھیتوں میں آئے گا۔ اس کی مسکراہٹ پھر نئے دانوں میں دودھ بھر دے گی۔ اس کے من میں عجب کشمکش جاری تھی۔ دیوتا!..... پانی..... نہیں تو.....؟ نہیں تو وہ باہر چلا گیا تو کیا ہوا۔ کبھی تو اُسے دیا آئے گی ہی۔

ہلدی سنبھل کر بولی ”سچ مانو، میرے پتی، دیوتا پھر آئے گا یہاں.....“

چٹو کا بول اور بھی تیکھا ہو گیا۔ ”اری اب بس بھی کر۔ تیرا دیوتا کوئی سانپ تھوڑی ہے جو تیری بین سن کر بھاگا چلا آئے گا؟“

اُس دن رامو بمبئی سے لوٹ آیا۔ اسے دیکھ کر ہلدی کی آنکھوں کو ایک نئی زبان مل گئی۔ بولی ”سناؤ، رامو بھائی بمبئی میں دیوتا کو تو تم نے دیکھا ہوگا۔“
رامو خاموش رہا۔

میرا خیال تھا کہ رامو نے بمبئی میں مزدور سبھا کی تقریریں سن رکھی ہوں گی اور وہ صاف صاف کہہ دے گا کہ اُن آدمی آپ اُچھاتا ہے اپنے لہو سے، اپنے پسینے سے۔ اگر آدمی، آدمی کا لہو چوسنا چھوڑ دے تو آج ہی سنسار کی کایا پلٹ جائے۔ کال تو پہلے سے



پڑتے آئے ہیں۔ بڑے بڑے بھیانک کال۔ مگر اب سرمایہ دار روز روز کسانوں اور مزدوروں کا لہو چوستے ہیں اور غریبوں کے لیے اب سدا ہی کال پڑا رہتا ہے۔ اور یہ کال چھو منتر سے نہیں جانے کا۔ اس کے لیے تو سارے سماج کو جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے۔

ہلدی پھر بولی ”رامو بھائی! چپ کیوں سادھ لی تم نے؟..... ہمیں کچھ بتادو گے تو تمہاری وِڈیا تو نہ گھٹ جائے گی۔ بمبئی میں تو بہت برکھا ہوتی ہوگی۔ پانی سے بھری کالی اودی بدلیاں گھر آتی ہوں گی..... اور بجلی چمکتی ہوگی ان بدلیوں میں رامو!..... اور وہاں بمبئی میں دیوتا کو رتی بھر کشت نہ ہوگا.....“

رامو کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہونے کے فوراً بعد کسی قدر سنجیدگی میں بدل گئی۔ وہ بولا ”ہاں ہلدی! اُن دیو اب بمبئی کے محلوں میں رہتا ہے..... روپوں میں کھیلتا ہے..... بمبئی میں۔“ ہلدی کچھ نہ بولی۔ شاید وہ اُن کے متعلق سوچنے لگی جب ریل ادھر آنکلی تھی اور اُن دیو پہلی گاڑی سے بمبئی چلا گیا تھا۔

آنسو کی ایک بوند جو ہلدی کی آنکھ میں اٹکی ہوئی تھی، اس کے گال پر ٹپک پڑی۔ بڑے آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ میں نے کہا ”آج ضرور دھرتی پر پانی برسے گا۔“

ہلدی خاموشی سے اپنے بچے کو تھکنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ہوا اگر دیوتا کو وہاں سُندریاں مل جاتیں ہیں۔ کبھی تو اُسے گھر کی یاد ستائے گی ہی اور پھر وہ آپ ہی آپ ادھر چلا آئے گا۔

— دیوند رستیا رتھی

سوالوں کے جواب لکھیے:

- 1- برہما نے اُن دیوتا کو کیا سند لیس (پیغام) بھیجا؟
- 2- چنٹو اُن دیوتا سے ناراض کیوں رہتا تھا؟
- 3- مصنف نے کہانی کے آخری حصے میں کال کا ذمہ دار کسے ٹھہرایا ہے اور کیوں؟

